خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کے موقف اور حنفی مذہب میں فرق

(ایک تحقیقی جائزہ)

Difference in the Position of Imam Abu Hanifah and the Hanafi School on the Legality of Rebellion: (A Critical Analysis)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد[1]

ڈاکٹر سعدیہ تبسم[2]

ABSTRACT

The position of Imam Abu Hanifah (d. 150/767) on the issue of resistance against unjust rulers is well-known. However, some scholars opine that this was his solitary opinion and that the Hanafi School adopted a different position. This article examines this hypothesis and after reviewing the basic texts of the Hanafi School it finds four foundational principles of Imam Abu Hanifah on this issue. They are: (1) ‘Ali b. Abi Talib (God be pleased with him) was right in his wars against rebels; (2) Probity (‘adl) is an essential condition for a Muslim ruler; (3) enjoining good and preventing evil is the obligations of Muslims individually as well as collectively; and (4) The rule of a usurper or unjust person can only be tolerated on the basis of choosing the lesser of the two evils. After a thorough analysis of some significant manuals of the Hanafi School, particularly *Radd al-Muhtar* of of ‘Allamah Ibn ‘Abidin al-Shami (d. 1252/1836), the article concludes that the hanafi School acknowledged and

---

1۔ ڈائریکٹر جنرل، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد(mushtaqahmad@iiu.edu.pk

2۔ اسسٹنٹ پروفیسر قانون، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد(sadia.tabassum@iiu.edu.pk)

applied all these four principles and that is why the position of the Hanafi School on this issue is the same as that of its founder.
Key Words: Resistance, unjust ruler, usurper, Abu Hanifah, Hanafi School

تمہید

ظالم حکمران کے خلاف خروج کے مسئلے میں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ/۷۶۷ھ) کے موقف کی تفصیلی تحقیق مولانا سید ابوالاعلی مودودی (م ۱۹۷۹ء) کہ اس موقف کا خلاصہ یہ ہے کہ ظالم حکمران کو ظلم سے روکنا واجب ہے اور اس کے لیے خروج کی راہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس راہ میں بڑی خونریزی کا امکان ہوتا ہے اس لیے خروج سے پہلے اس بات خروج کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ نیز اس بات کا بھی اطمینان کرنا ضروری ہے کہ ظالم حکمران کے خلاف نکلنے والے ایک متبادل صالح قیادت لا رہے ہیں کیونکہ یہ بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں کسی بڑے شر کی راہ ہموار نہ ہو جائے۔ اگر خروج میں زیادہ خونریزی ہو رہی ہو اور حکمران کے ہٹانے کا کام ممکن نظر نہ آتا ہو یا متبادل صالح قیادت میسر نہ ہو تو پھر خروج سے باز رہنا چاہیئے کیونکہ اس طرح خروج کرنے والے نہ صرف خود کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں بلکہ دوسرے صالحین کے حوصلے پست کرنے کا بھی باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ جب تک خروج کے لیے مناسب موقع نہ ملے ضروری ہے کہ حکمران کے ناجائز کاموں اور غلط فیصلوں پر تنقید جاری رکھی جائے، اس کے ناجائز احکام ماننے سے انکار کیا جائے، اس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں تک ہو سکے شریعت کی بالادستی یقینی بنانے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔[3]

3۔ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر دو مقالات لکھے: "مسئلۂ خلافت میں امام ابو حنیفہ کا مسلک" اور "خروج کے بارے میں امام ابو حنیفہ کا مسلک"۔ اول الذکر مقالہ پہلے ماہنامہ "ترجمان القرآن" لاہور میں اگست۔ ستمبر ۱۹۶۳ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا، جبکہ ثانی الذکر مقالہ اسی رسالے میں نومبر اور ۱۹۶۳ء اور جنوری ۱۹۶۴ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ یہ دونوں مقالات بعد میں مولانا مودودی کے مجموعۂ مضامین "تفہیمات" کی تیسری جلد میں بھی شائع ہوئے، جبکہ پہلا مقالہ "خلافت و ملوکیت" میں بھی ایک باب کے طور پر شائع ہوا۔ ان مقالات میں مولانا مودودی نے جو موقف مختصراً پیش کیا ہے، وہ ان سے قبل انتہائی شرح و بسط کے ساتھ

چونکہ کئی اصحابِ علم کی راے یہ ہے کہ متاخرین فقہائے احناف کا موقف امام ابو حنیفہ کے موقف سے مختلف ہے، اس لیے خروج کے متعلق مولانا مودودی کے مضمون پر بھی بعض اہلِ علم کی جانب سے یہ تنقید کی گئی اور حنفی فقہائے کرام کی بعض عبارات پیش کر کے یہ موقف اختیار کیا گیا کہ حنفی مذہب اس موقف سے مختلف ہے۔ اس کے جواب میں مولانا مودودی نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ امام ابو حنیفہ کے موقف کی وضاحت کر رہے ہیں، نہ کہ حنفی مذہب کی۔[4] اس مضمون میں ہم اس امر کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ کیا واقعی خروج کے مسئلے پر امام ابو حنیفہ کے موقف اور حنفی مذہب میں فرق ہے یا اس فرق کے قائلین کو اس باب میں غلط فہمی لاحق ہوئی ہے؟

امام ابو حنیفہ کا موقف ہی حنفی مذہب ہے، الا یہ کہ اس کے برعکس ثابت کیا جاسکے۔

امام ابو حنیفہ کے موقف اور حنفی مذہب میں فرق کوئی انوکھی بات نہیں ہے اور کئی مسائل میں ایسا ہوا ہے کہ حنفی فقہائے کرام نے امام ابو حنیفہ کے بجائے ان کے صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) یا ان میں سے کسی ایک کے موقف کو "حنفی مذہب" قرار دیا ہے اور اسی پر فتوی دیا ہے۔[5] تاہم حنفی فقہاے کرام کے اصول اور منہج کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں پہلا مفروضہ یہی ہے کہ جو امام ابو حنیفہ کا موقف ہے وہی حنفی مذہب ہے، الا یہ

مولانا مناظر احسن گیلانی (م ۱۹۵۶ء) نے اپنی کتاب "حضرت امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی" میں بھی پیش کیا تھا۔ زیرِ نظر مقالے میں مولانا مودودی کے مضامین کے حوالے تفہیمات، ج ۳، (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء) سے دیے گئے ہیں۔

4۔ "میرے مقالے کا موضوع ہے اس خاص مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ کا مسلک۔ اور آپ استدلال میں پیش فرما رہے ہیں مذہبِ حنفی کے اقوال۔" تفہیمات، ج ۳، ص ۳۱۸۔

5۔ مثلاً مزارعت اور مساقات کے مسئلے میں صاحبین کی راے کو حنفی مذہب مانا جاتا ہے۔ (برہان الدین علی بن ابی بکر المرغینانی، الهداية شرح بداية المبتدی (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ت-ن۔)، ج ۴، ص ۳۳۷۔)

کہ اس مفروضے کے خلاف قوی دلائل ملیں۔[6] اس لیے اس بحث میں نکتۂ آغاز یہی ہے کہ یہ حنفی مذہب ہے اور بارِ ثبوت اس فریق پر ہے جو اسے حنفی مذہب ماننے سے انکاری ہو۔

ایسے امور میں، جہاں حنفی فقہاے کرام نے امام ابو حنیفہ کی راے چھوڑ کر صاحبین یا کسی اور کی راے کو مذہب حنفی مذہب مانا ہو، اس اختلاف کو حنفی مذہب کی بنیادی کتابوں میں بالتفصیل ذکر کیا گیا ہے۔ یہ امر بالخصوص امہات المسائل میں اختلاف کے مواقع پر معلوم ہوتا ہے جب مذہب کی بنیادی کتابوں میں[7] اس کی پوری تفصیل دی جاتی ہے۔[8] پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ خروج کے مسئلے میں امام اور صاحبین کے درمیان اختلاف کی ایسی کوئی تفصیل ان امہات الکتب میں نہیں ملتی۔

چنانچہ جس مسئلے میں بھی حنفی مذہب نے امام ابو حنیفہ کی رائے چھوڑ کر صاحبین کی یا ان میں سے کسی ایک کی رائے اختیار کی ہے تو مذہب کے مشائخ نے امام کی رائے چھپائی نہیں ہے بلکہ اس پر تفصیلی بحث کر کے واضح کیا ہے کہ کیوں فتوی امام کے قول کے بجائے دوسرے قول پر ہے۔ خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کا موقف اتنا واضح اور مشہور تھا کہ اس سے اغماض برتنا امام سرخسی، امام کاسانی اور امام مرغینانی جیسے بلند پایہ فقہاے کرام کے لیے ممکن ہی نہیں تھا، بالخصوص جبکہ اس کی تفصیل امام جصاص نے احکام القرآن میں بھی دی تھی۔[9] ان میں سے جب کسی نے بھی

6۔ علامہ ابن عابدین شامی (م ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء) اور دیگر حنفی فقہاے کرام نے پہلے تصریح کی ہے کہ فتوی امام کی رائے پر ہی دیا جائے گا اور اس کے بعد اس بنیادی مفروضے سے مستثنیات ذکر کی ہیں۔ محمد امین ابن عابدین، شرح عقود رسم المفتی (لاہور: سہیل اکیڈمی، ۱۹۷۶ء)، ص ۲۱-۲۲۔

7۔ مذہب کی بنیادی کتابوں سے یہاں خصوصاً مراد امام ابو بکر احمد بن علی الجصاص الرازی (م ۳۷۰ھ/۹۸۰ء) کی شرح مختصر الطحاوی، امام ابو بکر محمد بن ابی سہل السرخسی (م ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء) کی المبسوط، امام علاؤ الدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی (م ۵۸۷ھ/۱۱۹۱ء) کی بدائع الصنائع اور امام مرغینانی (م ۵۹۳ھ/۱۱۹۷ء) کی الھدایۃ ہیں۔

8۔ مثلاً کتاب الوقف کی ابتدا میں امام سرخسی تفصیل سے بتاتے ہیں کہ امام محمد کو امام ابو حنیفہ کی رائے سے اختلاف تھا اور اس وجہ سے وہ اس کتاب کی جزئیات نہیں لکھ پا رہے تھے۔ (المبسوط (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۷ء)، ج ۱۲، ص ۳۴-۳۵)

9۔ ابو بکر الجصاص الرازی، احکام القرآن (کراچی: قدیمی کتب خانہ، ت۔ن۔)، ج ۱، ص ۹۹-۱۰۱۔

امام کے اس موقف کے خلاف دلائل اکٹھے نہیں کیے تو مفروضہ یہی بنتا ہے کہ امام کے موقف اور ان کے موقف میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ تو اس مسئلے کا سلبی پہلو ہوا۔

ایجابی پہلو سے دیکھیں تو حنفی مذہب کی تمام مستند متون میں تفصیلی شواہد اس امر کے حق میں موجود ہیں کہ خروج کے بارے میں حنفی مذہب وہی ہے جو امام ابو حنیفہ کا موقف ہے۔ جہاں تک متاخرین کی کتب میں موجود بعض عبارات کا تعلق ہے جن سے بظاہر اس کے برعکس بات معلوم ہوتی ہے، تو ایک تو مذہب کی متون معتبرہ کے سامنے ان ثانوی مآخذ کی کوئی حیثیت نہیں ہے؛ اور متون کی روشنی میں ان عبارات کی بھی صحیح تاویل بالکل ممکن ہے جس کے بعد ان عبارات کو مسترد کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ اس امر کی وضاحت کے لیے ہم پہلے اس سوال پر بحث کرنا چاہیں گے کہ خروج کے جواز یا وجوب کے متعلق امام ابو حنیفہ کے موقف کی بنیاد کیا ہے؟

خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کے موقف کی چار بنیادیں

خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کے موقف کی بنیاد چار اصولوں پر ہے جن میں ایک کا ذکر عقیدے کی کتب میں کیا جاتا ہے اور تین پر بات فقہی ذخیرے میں ہوتی ہے۔ جہاں تک عقیدے کی کتب میں مذکور بنیادی اصول کا تعلق ہے تو وہ صحابۂ کرام، خلفاے راشدین اور بالخصوص سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ کی عدالت اور حق پرستی کے بارے میں ہے۔ چنانچہ عقیدۂ طحاویہ میں، جس کا متن عظیم حنفی فقیہ امام ابو جعفر احمد بن محمد بن سلمہ الازدی الطحاوی (م ۳۲۱ھ/ ۹۳۳ء) نے لکھا، سب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرار دیا گیا ہے کہ ہم سب سے محبت کرتے ہیں، نہ کسی ایک کی محبت میں غلو کرتے ہیں، نہ ان میں کسی پر تبرا کرتے ہیں، نہ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو صحابۂ کرام کو برا کہتے ہیں اور ہم صحابہ کر ذکر خیر کے ساتھ ہی کرتے ہیں۔[10] اس کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے

10۔ "ہم رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے محبت کرتے ہیں اور ان میں کسی ایک کی محبت میں افراط نہیں کرتے، نہ ہی ان میں کسی ایک پر بھی تبرا کرتے ہیں۔ ہم ان سے بغض رکھتے ہیں جو ان سے بغض رکھے اور ان کے بارے میں برا ذکر کرے۔ ہم ان کا ذکر صرف خیر کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان کی محبت دین ہے، ایمان ہے اور احسان ہے؛ اور ان کے ساتھ بغض کفر ہے، نفاق ہے اور سرکشی ہے۔" القاضی علی بن علی ابن ابی العز الدمشقی، شرح العقیدۃ الطحاویۃ (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۹۰)، ص ۶۸۹۔

درمیان فضیلت کی ترتیب اسی طرح بیان کی گئی ہے جیسے ان کی تاریخی ترتیب ہے۔[11] اسی طرح فرمایا گیا کہ صحابۂ کرام، رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات اور اولاد کے متعلق ہلکی بات سے گریز ضروری ہے۔[12] نیز امام ابو حنیفہ کے سارے سوانح نگاران کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ سیدنا علی کرم اللہ وجہہ جس جنگ میں بھی شریک ہوئے اس میں وہ حق پر تھے۔[13] واضح رہے کہ امام طحاوی تصریح کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ امام ابو حنیفہ اور ان کے صاحبین، امام ابو یوسف اور امام محمد، کا ہے۔[14]

خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کے موقف کی فقہی بنیادوں میں ایک اصول یہ ہے کہ دین کے کسی حکم کی روایت کرنے والا راوی ہو، عدالت میں کسی شرعی حق کی گواہی دینے والا گواہ ہو، شرعی حقوق کا فیصلہ کرنے والا قاضی ہو، یا شریعت کے نفاذ کی ذمہ داری اٹھانے والا حکمران ہو، سب کے لیے "عدالت" شرط ہے۔[15] یہ الگ بات ہے کہ اگر فاسق گواہ کی گواہی پر قاضی نے فیصلہ سنایا، یا قاضی خود فاسق ہو، یا اس قاضی کی تعیناتی کرنے والا حکمران ہی فاسق ہو، تب بھی فیصلہ نافذ ہوگا اگر وہ فیصلہ شریعت کے مطابق ہو۔[16] بہ الفاظِ دیگر، امام ابو حنیفہ قاضی یا حکمران کی قانونی حیثیت (*de jure*) اور بطور امر واقعہ ان کے قاضی یا حکمران کے منصب پر فائز ہونے کی حقیقت (*de*

11۔ "ہم رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت سب سے پہلے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے مانتے ہیں یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ انھیں فضیلت اور پوری امت پر تقدیم حاصل ہے؛ پھر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے لیے؛ پھر عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے لیے؛ اور پھر علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لیے۔ یہی خلفاے راشدین اور ہدایت یافتہ امام ہیں۔" ایضاً، ص ۶۹۸، ۷۱۰، ۷۱۲، ۷۲۱، ۷۲۶۔

12۔ "اور جس نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اور آپ کی ازواج اور مقدس اولاد کے متعلق، جو ہر گندگی سے پاک ہیں، اچھی بات کہی تو وہ نفاق سے بری ہوا۔" ایضاً، ص ۷۳۷۔

13۔ الجصاص، احکام القرآن، ج ۳، ص ۳۹۶۔ یہ بات اپنی جگہ نہایت اہم ہے کیونکہ جس دور میں امام ابو حنیفہ یہ بات کر رہے تھے اس دور میں اس بات کا براہ راست تعلق خلافت و حکومت کے حق سے تھا۔

14۔ "یہ ذکر ہے اہل سنت کے عقیدے کی وضاحت کا بمطابقِ مذہبِ فقہاے ملت ابو حنیفہ النعمان بن ثابت الکوفی، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری اور ابو عبد اللہ محمد بن الحسن الشیبانی رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور دین کی ان بنیادوں کا جن کا وہ اعتقاد رکھتے تھے اور جن پر وہ جہانوں کے رب کی بندگی کرتے تھے۔" ایضاً، ص ۱۳۔

15۔ الجصاص، احکام القرآن، ج ۱، ص ۱۰۰۔

16۔ المرغینانی، الھدایۃ، ج ۳، ص ۱۰۱۔

facto) کے درمیان فرق کرتے تھے۔ چنانچہ اگر فاسق شخص طاقت کے بل بوتے پر حکمران ہوا اور اپنا فیصلہ نافذ کر سکتا ہو تو اس کے وہ فیصلے نافذ ہوں گے جو شریعت کے مطابق ہوں لیکن اس نفاذ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ حکمران قانوناً جائز حکمران ہے۔ یہ وہ فرق ہے جسے اس بحث میں عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے۔ جائز حکمران کی اطاعت بھی صرف جائز احکام میں ہی کی جاتی ہے اور متغلب (usurper) کا بھی یہی حکم ہے لیکن متغلب کی حکمرانی بہر حال خلافِ قانون ہے۔ تغلب کی وجہ سے اس کے ان فیصلوں کے نفاذ سے، یا ان احکام کی اطاعت سے، جو شریعت کے مطابق ہوں، اس کی حکمرانی کو جواز نہیں ملتا۔

دوسرا اہم فقہی اصول یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مسلمان کا فریضہ ہے[17] اور اس فریضے کی ادائیگی میں بعض اوقات جیسے ظالم اور جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کی نوبت آتی ہے، ایسے ہی کبھی ظالم اور جابر کا ہاتھ روکنے کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور اس کوشش میں کسی کو موت آئے تو وہ شہید ہے۔[18] امام ابو حنیفہ نے خراسان کے بلند مرتبت فقیہ امام ابراہیم الصائغ کو خود یہ حدیث سنائی : افضل الشهداء حمزة بن عبد المطلب و رجل قام الى امام جائر فامره بالمعروف و نهاه عن المنكر فقتل -(شہیدوں میں بہترین حمزہ بن عب المطلب ہیں اور وہ شخص جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر اچھے کام کی اور برے کام سے روکنے کی پاداش میں قتل کیا جائے۔)اس کے بعد ہی امام ابراہیم نے عباسی گورنر ابو مسلم خراسانی کے سامنے کئی دفعہ کلمۂ حق کہا اور بالآخر انہیں شہید کیا گیا۔[19]

تیسرا اہم فقہی اصول اخف الضررین کا ہے جس کا آسان الفاظ میں مفہوم یہ ہے کہ جب دستیاب آپشنز میں ہر آپشن سے کوئی ضرر واقع ہوتا ہو تو وہ آپشن اختیار کیا جائے گا جس کے نتیجے میں کم تر ضرر واقع ہو۔ چنانچہ امام عبد اللہ بن المبارک روایت کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے ابراہیم الصائغ سے فرمایا تھا:

17۔ اس فریضے کے لیے کئی نصوص سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ آیات ملاحظہ کیجیے: سورۃ حٰم السجدۃ، آیات ۳۳-۳۶؛ سورۃ النحل، آیت ۱۲۵؛ سورۃ التوبۃ، آیت ۶۷۔ یہ مسلم امت کا اجتماعی فریضہ بھی ہے (سورۃ آل عمران، آیت ۱۰۴) اور اس وجہ سے ان کے حکومت کی بنیادی ذمہ داریوں میں اس کا شمار ہوتا ہے (سورۃ الحج، آیت ۴۱)۔

18۔ سنن ابی داود، کتاب الملاحم، باب الامر والنهی-

19۔ الجصاص، احکام القرآن، ج ۱، ص ۹۹۔

هذه فريضة ليست كسائر الفرائض لان سائر الفرائض يقوم بها الرجل وحده و هذا متى امر به الرجل وحده اشاط بدمه و عرض نفسه للقتل، فاخاف عليه ان يعين على قتل نفسه- و اذا قتل الرجل، لم يجترىء غيره ان يعرض نفسه- و لكنه ينتظر۔[20]

(یہ فریضہ دیگر فرائض کی طرح نہیں ہے جنہیں کوئی شخص تنہا بھی ادا کر سکتا ہے۔ یہ کام ایسا کہ تنہا آدمی اس کے لیے کھڑا ہو گا تو اپنی جان دے گا اور خود کو ہلاکت میں ڈالے گا، اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے قتل میں اعانت کا ذمہ دار ٹھہرے گا۔ پھر جب ایک ایسا شخص قتل کیا جائے گا تو پھر کوئی دوسرا اس کام کے لیے اپنی جان ہلاکت میں ڈالنے کی ہمت نہیں کر پائے گا۔ پس اسے بلکہ انتظار کرنا چاہیے۔)

پس امام ابو حنیفہ کے موقف کا خلاصہ یہ ہوا کہ ظالم حکمران کو ظلم سے روکنا واجب ہے اور اس کے لیے خروج کی راہ بھی اختیار کی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس راہ میں بڑی خونریزی کا امکان ہوتا ہے اس لیے خروج سے پہلے اس بات خروج کی کامیابی کے امکانات کا جائزہ لینا ضروری ہے اور جب تک خروج کے لیے مناسب موقع نہ ملے ضروری ہے کہ حکمران کے ناجائز کاموں اور غلط فیصلوں پر تنقید جاری رکھی جائے، اس کے ناجائز احکام ماننے سے انکار کیا جائے، اس کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی جائے اور جہاں تک ہو سکے شریعت کی بالادستی یقینی بنانے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔

حنفی مذہب نے یہ چاروں بنیادیں تسلیم کی ہیں۔

چنانچہ امام جصاص فرماتے ہیں:

قاتل علی رضی اللہ عنه الفئة الباغة بالسيف، و معه من كبراء الصحابة و أهل بدر من قد علم مكانهم، و كان محقاً فی قتاله لهم، لم يخالف فيه أحد الا الفئة الباغية التی قابلته و أتباعها-[21]

(علی رضی اللہ عنہ نے باغی گروہ سے تلوار کے ساتھ جنگ کی اور ان کے ساتھ وہ بزرگ صحابہ اور اہل بدر موجود تھے جن کا مرتبہ معلوم ہے، اور وہ اس گروہ کے ساتھ جنگ میں حق بجانب تھے۔ اس معاملے میں کسی نے اختلاف نہیں کیا سوائے اس باغی گروہ نے جنھوں نے ان کا مقابلہ کیا اور ان کے متبعین نے۔)

20۔ ایضاً، ص ۴۹۔ ۵۰۔

21۔ ایضاً، ج ۳، ص ۳۹۵۔

امام سرخسی نے یہی بات ایک اور انداز میں پیش کی ہے۔ چنانچہ وہ حضرت سفیان بن عیینہ کا یہ قول اپنی تائید کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

بعث الله تعالى رسول الله صلى الله عليه وسلم باربعة سيوف سيف قاتل به بنفسه عبدة الاوثان وسيف قاتل به أبو بكر رضي الله تعالى عنه أهل الردة ---وسيف قاتل به عمر رضى الله تعالى عنه المجوس ---وسيف قاتل به على رضى الله تعالى عنه المارقين والناكثين والقاسطين ۔ [22]

(اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو چار تلواروں کے ساتھ بھیجا؛ ایک تلوار سے آپ نے خود بت پرستوں سے جنگ کی؛ دوسری تلوار سے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے جنگ کی؛ تیسری تلوار سے عمر رضی اللہ عنہ نے مجوس سے جنگ کی اور چوتھی تلوار سے علی رضی اللہ عنہ نے اطاعت سے نکلنے والوں، عہد توڑنے والوں اور انصاف نہ کرنے والوں سے جنگ کی۔)

اسی طرح امام مرغینانی، صاحب ہدایہ، فرماتے ہیں:

يجوز التقلد من السلطان الجائر، كما يجوز من العادل، لأن الصحابة رضي الله عنهم تقلدوه من معاوية رضي الله عنه والحق كان بيد علي رضي الله عنه في نوبته۔[23]

(ظالم حکمران کی جانب سے قاضی کی تعیناتی جائز ہے جیسے عادل سلطان کی جانب سے جائز ہوتی ہے کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے تعیناتی قبول کی حالانکہ ان کے مقابلے میں حق علی رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔)

22۔ السرخسی، المبسوط، ج ۱۰، ص ۴۔

23۔ المرغینانی، الھدایۃ، ج ۳، ص ۱۱۱۔

چنانچہ یہ معلوم ہوا کہ حنفی مذہب نے امام ابو حنیفہ کی طرح یہ اصول مانا ہے کہ سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ اپنی تمام جنگوں میں حق پر تھے اور ان کے خلاف لڑنے والوں سے غلطی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ حنفی میں خروج اور بغی کے احکام کے لیے سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ کے اسوہ کو بنیادی ماخذ مانا جاتا ہے[24] اور آپ کو اس باب میں امام مانا جاتا ہے۔[25]

اسی طرح یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ حنفی مذہب کے مطابق جو شرائط گواہ کے لیے ہیں، وہ ساری شرائط قاضی کے لیے بھی ہیں اور حکمران کے لیے بھی۔ چنانچہ امام سرخسی نے تصریح کی ہے کہ اہلیتِ شہادت کے لیے تین بنیادی شرائط ہیں: عقل، ضبط (حافظہ) اور عدالت۔[26] اسی طرح امام مرغینانی فرماتے ہیں:

حکم القضاء يستقى من حكم الشهادة لأن كل واحد منهما من باب الولاية، فكل من كان أهلا للشهادة يكون أهلا للقضاء وما يشترط لأهلية الشهادة يشترط لأهلية القضاء۔[27]

(قضاء کی قانونی حیثیت گواہی کی قانونی حیثیت سے لی جاتی ہے کیونکہ یہ دونوں ولایت کے باب میں سے ہیں۔ پس جو شخص گواہی کے لیے اہل ہو، وہ قضاء کے لیے بھی اہل ہے اور جو شرائط گواہی کے لیے رکھی جاتی ہیں وہی شرائط قضاء کے لیے بھی ہیں۔)

24۔ امام محمد بن الحسن الشیبانی (م ۱۸۹ھ / ۸۰۵ء) نے خروج اور بغی کے احکام کے لیے سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ کے اسوہ کو بنیادی ماخذ کے طور پر مان کر مسلسل اس سے استدلال کیا ہے۔ فقہ حنفی کی بنیادی کتاب "الاصل" میں متعلقہ بحث کے لیے دیکھیے: محمد بوینو کالن، الاصل للامام محمد بن الحسن الشیبانی (بیروت: دار ابن حزم، ۲۰۱۲ء)، ج ۷، ص ۵۱۲-۵۲۳۔ نیز "السیر الصغیر" کے متن کے لیے دیکھیے:
Mahmood Ahmad Ghazi, *Shorter Book on Muslim International Law* (Islamabad: Islamic Research Institute, ۱۹۹۸), ۷۵-۷۷.

25۔ السرخسی، المبسوط، ج ۱۰، ص ۱۳۲۔ اسی طرح کتب فقہ میں آپ کے متبعین کو "اہل عدل" اور آپ کے مخالفین کو "اہل بغی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

26۔ ایضاً، ج ۱۶، ص ۱۱۳۔

27۔ المرغینانی، الهداية، ج ۳، ص ۱۱۷۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر فاسق کو قاضی مقرر کیا گیا تو اس کے فیصلے نافذ ہوں گے لیکن مناسب نہیں ہے کہ فاسق کو قاضی مقرر کیا جائے [28]۔ آگے فرماتے ہیں کہ اگر قاضی عدل ہو لیکن بعد میں فاسق ہو جائے تو خود بخود معزول نہیں ہوتا لیکن حکمران پر لازم ہو جاتا ہے کہ اسے معزول کر دے، اور یہی حنفی مذہب ہے اور ہمارے مشائخ اسی کے قائل ہیں۔[29]

اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حنفی مذہب گواہی اور قضاء دونوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ابواب میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ اسی اصول پر حنفی فقہاے کرام باغیوں کی جانب سے، جن کا فاسق ہونا معلوم ہے، متعین کیے گئے قاضی کے فیصلوں کے نفاذ کے قائل ہیں۔ امام سرخسی فرماتے ہیں:

ان الحكم بالعدل ودفع الظلم عن المظلوم من باب الامر بالمعروف والنهى عن المنكرم وذلك فرض على كل مسلم؛ الا أن كل من كان من الرعية، فهو غير متمكن من الزام ذلك - فاذا تمكن من ذلك بقوة من قلّده، كان عليه أن يحكم بما هو فرض عليه، سواء كان من قلّده باغياً أو عادلاً؛ فان شرط التقليد: التمكن، وقد حصل۔ [30]

(عدل پر فیصلہ اور مظلوم سے ظلم کا دور کرنا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں شامل ہیں جو ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔ البتہ جو شخص رعیت میں سے ہو اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس کو دوسروں پر نافذ کر سکے۔ پس جس نے اسے قضاء کی ذمہ داری سونپی اس کی قوت کی وجہ سے جب اس کے امکان میں یہ بات آگئی تو اس پر لازم ہوا کہ اس فریضے کی ادائیگی کرے، خواہ اسے یہ ذمہ داری سونپنے والا باغی ہو یا عادل ہو، کیونکہ ذمہ داری عائد ہونے کی شرط یہ تھی کہ اس کی ادائیگی اس کے لیے ممکن ہو اور یہ شرط پوری ہوگئی ہے۔)

یہ نہایت اہم اصول ہے اور خروج کے جواز یا وجوب کی بنیاد ہی اسی اصول پر ہے اور اس کا براہ راست تعلق اس حدیثِ مبارک سے ہے جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کے تین مراتب ذکر کیے گئے ہیں: دل میں کسی برائی کو نیکی میں بدلنے کا عزم پالنا؛ برائی کے خلاف آواز بلند کر کے اس بدلنے کی کوشش کرنا؛ اور طاقت

28۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔

29۔ ایضاً۔ اس اصول پر آگے مزید بحث علامہ شامی کی تحقیق کے ضمن میں آ رہی ہے۔

30۔ السرخسی، المبسوط، ج ۱۰، ص ۱۳۸۔

کے استعمال کے ذریعے برائی کو بدلنے کی کوشش کرنا۔[31] اس میں کوئی الجھن نہیں ہے کہ ان میں پہلا مرتبہ ہر مسلمان سے مطلوب ہے کیونکہ حدیث میں اسے ایمان کا کمزور ترین درجہ کہا گیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی مسلم ہے کہ زبان سے برائی کی روک تھام اور نیکی کے فروغ کی کوشش ہر مسلمان سے مطلوب ہے۔ البتہ برائی کو زبرستی روکنے کے مرتبے کے متعلق کئی حلقوں کی جانب سے یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ کام صرف حکومت کا ہے۔[32] سوال یہ ہے کہ اس کام کو صرف حکومت تک محدود رکھنے کی شرعی وجہ کیا ہے؟ کیا باپ کو اپنے بچوں کو زبردستی کسی غلط کام سے روکنے کا حق حاصل ہے؟ کیا شوہر بیوی کو یا کسی ادارے کا سربراہ اس ادارے کے کسی رکن کو کسی کا پابند کر سکتا ہے؟ کیا کمانڈر اپنے ماتحتوں کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کر سکتا ہے اگر وہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کریں؟ اگر ان سوالوں کے جواب اثبات میں ہیں،[33] تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ امر بالمعروف بالید کو صرف "حکومت" تک محدود کر رہے ہیں وہ قانون کی نہایت سادہ تعبیر پیش کر رہے ہیں اور اصل پیچیدگیوں سے گریز کر رہے ہیں۔

فقہائے کرام برائی سے زبردستی روکنے، یا نیکی پر زبردستی مجبور کرنے کے اختیار کو "ولایہ" کے تصور کے تحت لاتے ہیں۔ ولایہ سے مراد یہ ہے کہ شرعاً کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کو اپنے فیصلے کا پابند بنانے کا اختیار

31۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب کون النھی عن المنکر من الایمان۔

32۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجیے: جاوید احمد غامدی، میزان (لاہور: المورد، ۲۰۰۹ء)، ۵۵۷۔

33۔ فقہائے کرام ان سوالات کو تعزیر کے عمومی تصور کے تحت زیر بحث لاتے ہیں اور قرار دیتے ہیں کہ ان امور میں تعزیر دی جا سکتی ہے اور یہ تعزیر حق العبد کی خلاف ورزی پر ہوتی ہے جس کی تنفیذ کا اختیار متعلقہ فرد (باپ، شوہر، آقا، کمانڈر) کو حاصل ہوتا ہے جس کے حق کی خلاف ورزی ہوئی ہوتی ہے۔ نیز چونکہ تعزیر کی یہ نوعیت "سزا" کی نہیں بلکہ "تادیب" کی ہے، اس لیے یہ بچوں کو بھی دی جا سکتی ہے، جیسے حدیث میں آیا ہے کہ بچے کی عمر دس سال ہو جائے اور وہ نماز نہ پڑھے تو اس کی تادیب کرو۔ مزید تفصیل اور تعزیر کی اس قسم کی سزاؤں کی عمومی اقسام سے فرق کے لیے دیکھیے:
Muhammad Mushtaq Ahmad, “The Doctrine of *Siy¬sah* in the hanafi Criminal Law and Its Relevance for the Pakistani Legal System,” *Islamic Studies* ۵۱:۱ (۲۰۱۵ء), ۲۹-۵۵.

حاصل ہو[34] سوال یہ ہے کہ اس حکم کی علت فقہاے کرام کیا بیان کرتے ہیں؟ صاحبِ ہدایہ، امام مرغینانی فرماتے ہیں: والأمر بالمعروف باليد إلى الأمراء لقدرتهم (ہاتھ سے امر بالمعروف کرنا حکومت چلانے والوں کا کام ہے کیونکہ وہ اس کی قدرت رکھتے ہیں۔)[35] یہاں یہ الفاظ "لقدرتهم" (کیونکہ وہ اس کی قدرت رکھتے ہیں) نہایت اہم ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو امام ابو حنیفہ نے فقیہِ خراسان ابراہیم الصائغ سے کہی تھی کہ قدرت نہ رکھنے کے باوجود اگر کوئی شخص امر بالمعروف کے لیے اقدام کرے گا تو مزید نقصان کا باعث بنے گا۔[36] پس حنفی مذہب نے وہ اصول بعینہ اپنایا ہے جس پر خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کا موقف قائم تھا کہ جو لوگ ہاتھ سے دوسروں کو روکنے کی قدرت رکھتے ہیں، ان کے لیے یہ امر فریضے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اگر قدرت رکھے بغیر کوئی یہ کام کرنے کی کوشش کرے گا تو زیادہ نقصان کا باعث بنے گا۔

اگر دو مسلمان گروہ آپس میں لڑ رہے ہوں، تو امام سرخسی نے تفصیل سے واضح کیا ہے کہ اگر یہ معلوم ہو کہ ان لڑنے والوں میں ایک فریق زیادتی کر رہا ہے تو جس کے خلاف زیادتی ہو رہی ہے اس کی مدد کے لیے اٹھنا اور زیادتی کرنے والے کو زیادتی سے روکنا لازم ہے؛ البتہ اگر یہ معلوم نہ ہو رہا ہو کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر، تب کسی فریق کا ساتھ دینا جائز نہیں ہے لیکن لڑائی کی روک تھام اور اصلاح کی کوشش ضروری ہے؛ ہاں جو زیادتی کرنے والوں کے خلاف عملی جدوجہد کی استطاعت نہیں رکھتا تو اسے رخصت حاصل ہے:

اعلم ان الفتنة اذا وقعت بين المسلمين فالواجب على كل مسلم ان يعتزل الفتنة و يقعد فى بيته۔[37]

34۔ علاؤالدین ابو بکر بن مسعود الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۲۰۰۳ء)، ج ۶، ص ۵۸۲ و ما بعد۔

35۔ المرغینانی، الهداية، ج ۳، ص ۳۰۷۔

36۔ اس واقعے پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھیے:
Sadia Tabassum, “Discourse on the Legality of Rebellion in the Hanafi Jurisprudence,” *Peshawar Islamicus* 8:2 (2017), 15-30.

37۔ المبسوط، ج ۱۰، ص ۱۳۴۔

(جان لو کہ جب مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی ہو تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اس خانہ جنگی میں شرکت سے گریز کرے اور اپنے گھر میں بیٹھ رہے۔)

فان كان المسلمون مجتمعين على واحد و كانوا امنين به، و السبيل امنة، فخرج عليه طائفة من المسلمين، فحينئذ يجب على من يقوى على القتال ان يقاتل مع امام المسلمين الخارجين۔[38]

(پھر اگر مسلمان ایک شخص کی اطاعت پر مجتمع ہوں اور اس پر اعتماد کرتے ہوں، اور راستے بھی پر امن ہوں، اور ایسی حالت میں مسلمانوں کا کوئی گروہ نکلے تو ایسی صورت میں ہر اس شخص پر، جو جنگ میں حصہ لے سکتا ہو، واجب ہے کہ وہ مسلمانوں کے حکمران کے ساتھ ان باغیوں کے خلاف لڑے۔)

و الامام فيه علی رضی الله عنه، فقد قام بالقتال و اخبر انه مامور بذلک بقوله رضی الله عنه: امرت بقتال المارقين و الناكثين و القاسطين۔[39]

(اس باب میں امام کی حیثیت علی رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے۔ پس انہوں نے باغیوں کے خلاف جنگ کی اور خبر دی کہ ان کو اس پر رسول اللہ ﷺ نے مامور کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے فرمایا: مجھے امام کی اطاعت سے نکلنے والوں، بیعت توڑنے والوں اور ناانصافی کرنے والوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔)

وہ واضح کرتے ہیں کہ بعض صحابہ نے خوارج کے خلاف جنگ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہیں دیا تو ان کے پاس عذر تھا:

و الذی روی أن ابن عمر رضی الله عنهما و غيره لزم بيته تأويله أنه لم يكن له طاقة على القتال، و هو فرض على من يطيقه۔[40]

(اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اور بعض دیگر صحابہ گھر میں بیٹھے رہے تو اس کی تاویل یہ ہے کہ (بیماری یا عذر کی بنا پر) وہ جنگ نہیں لڑ سکتے تھے اور یہ فرض صرف اسی پر عائد ہوتا ہے جو لڑنے کی طاقت رکھتا ہو۔)

اس امر کی وضاحت ایک اور مسئلے سے بھی ہو جاتی ہے۔ فقہائے احناف نے صراحت کی ہے کہ تنہا مسلمان کا کافروں کے لشکر میں گھس جانا صرف اس صورت میں جائز ہے جب وہ انہیں سخت نقصان پہنچا سکتا ہو اور عام حالات

38۔ ایضاً۔

39۔ ایضاً۔

40۔ السرخسی، المبسوط، ج ۱۰، ص ۱۳۲۔

میں یہ جائز نہیں ہے کیونکہ اس طرح وہ خود کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔اس کے برعکس اگر کئی مسلمان کسی ناجائز کام میں مصروف ہوں تو کوئی تنہا مسلمان انھیں اس برے کام سے باز رکھنے کے لیے نصیحت کر سکتا ہے خواہ اسے اندیشہ ہو کہ وہ ظالم اسے قتل کر دیں گے۔ان دو صورتوں میں فرق کی وضاحت کرتے ہوئے امام سرخسی کہتے ہیں :

فأما اذا كان يعلم أنه لا ينكى فيهم، فانه لا يحل له أن يحمل عليهم لأنه لا يحصل بحملته شيء مما يرجع الى اعزاز الدين، و لكنه يقتل فقط؛ و قد قال الله تعالىٰ: و لا تقتلوا أنفسكم- وهذا بخلاف ما اذا أراد أن ينهى قوماً من فَساق المسلمين عن منكر، و هو يعلم أنهم لا يمتنعون بنهيه و أنهم يقتلونه، فانه لا بأس له بالاقدام على ذلک، و هو العزيمة، و ان كان يجوز له الترخص بالسكوت لأن القوم هناک يعتقدون ما يأمرهم به، فلا بد من أن يكون فعله موَثراَ فى باطنهم -[41]

(جب اسے معلوم ہو کہ وہ ان کو ڈرا نہیں سکے گا تو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان پر حملہ کرے کیونکہ اس حملے سے وہ دین کو قوت دینے کا مقصد حاصل نہیں کر سکتا بلکہ صرف قتل کر دیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔اس کے برعکس اگر وہ بعض فاسق مسلمانوں کو کوئی برا کام کرتے دیکھ کر انہیں روکے باوجود اس کے کہ اسے علم ہو کہ اس کے روکنے سے وہ نہیں رکیں گے اور الٹا اسے قتل کر دیں گے، تو اس صورت میں اسے اس اقدام کی اجازت ہو گی اور یہی عزیمت کی راہ ہے، اگرچہ اسے خاموش رہنے کی رخصت ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مسلمان ہونے کی وجہ سے اس کام کو برا سمجھنے کا عقیدہ رکھتے ہیں جس سے وہ انہیں روکتا ہے۔پس اس کی دعوت لازماً ان کے دلوں پر کچھ اثر رکھے گی۔)

یہ موقف امام ابو حنیفہ کے موقف کے عین مطابق ہے۔اس امر کی تفصیلی وضاحت کے لیے اگلی فصل میں علامہ شامی کی تصریحات پیش کی جائیں گی تا کہ معلوم ہو کہ بالکل آخری دور میں بھی حنفی فقہاے کرام نے خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کے موقف ہی کی اتباع کی ہے۔

41۔ ابو بکر محمد بن ابی سہل السرخسی، شرح كتاب السير الكبير (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۹۷ء)، ج ۱، ص ۱۱۶۔ خود امام سرخسی نے امام ابو حنیفہ کی تقلید میں عزیمت ہی کی روش اختیار کی اور حکمران کے ایک ناجائز فیصلے کے خلاف آواز بلند کرنے کی پاداش میں چودہ سال تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

خروج کے متعلق علامہ شامی کی تحقیق

جیسا کہ معلوم ہے، علامہ شامی کی کتاب "رد المحتار" دراصل حاشیہ ہے، علامہ حصکفی کی "الدر المختار" پر جو علامہ تمرتاشی کے متن "تنویر الابصار" کی شرح ہے۔ چنانچہ کتاب سے بہتر طور پر مستفید ہونے کے لیے ہم متن، شرح اور حاشیہ تینوں کو الگ الگ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

علامہ تمرتاشی نے بغاۃ (جمع باغی) کی تعریف ان الفاظ میں پیش کی ہے: هم الخارجون عن الامام الحق بغير الحق (یہ وہ لوگ ہیں جو امامِ برحق کی اطاعت سے بغیر شرعی جواز کے نکل جائیں)۔[42] علامہ حصکفی نے شرح میں اس پر اضافہ کیا ہے: فلو بحق ، فليسوا ببغاة ؛ و تمامه فی جامع الفصولين (پس اگر وہ شرعی جواز رکھتے ہوں تو وہ باغی نہیں ہیں؛ اور اس کی پوری بحث "جامع الفصولین" میں ہے)۔[43] علامہ شامی نے ایک حاشیہ "الامام الحق" پر قائم کیا ہے اور اس کی وضاحت میں لکھا ہے: الظاهر ان المراد به: ما يعم به المتغلب لانه بعد استقرار سلطنته و نفوذ قهره لا يجوز الخروج عليه كما صرحوا به (اس سے بظاہر عموم مراد ہے جس میں متغلب بھی شامل ہے کیونکہ جب اس کی سلطنت قرار پائے اور اس کا غلبہ نافذ ہو جائے تو اس کے خلاف نکلنا جائز نہیں رہتا، جیسا کہ فقہاء نے صراحت کی ہے)۔[44]

اس موقف کی بنیاد "سد ذریعہ" کے تصور پر ہے کہ اگر اس حکومت کے خلاف لوگ اب اٹھیں گے تو مزید خونریزی اور فساد متوقع ہے۔ اس کی تائید اس اقتباس سے بھی ہوتی ہے جو علامہ شامی یہاں "الدر المنتقیٰ" سے پیش کرتے ہیں: ان هذا فی زمانهم؛ و اما فی زماننا فالحكم للغلبة؛ لان الكل يطلبون الدنيا فلا يدری العادل من الباغی۔ (یہ حق و ناحق کا حکم اُن کے دور میں تھا۔ ہمارے دور میں تو حکم یہ ہے کہ غالب آنے والوں کی اطاعت کی جائے کیونکہ سب دنیا کی طلب میں لگے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عدل کرنے والا کون اور بغی کرنے والا

42۔ محمد امین ابن عابدین الشامی، رد المحتار علی الدر المختار شرح تنویر الابصار (بیروت: دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۳ء)، ج ۶، ص ۴۱۱۔

43۔ ایضاً۔

44۔ ایضاً۔ یہ وہی موقف ہے جس "دوسو بنام ریاست" مقدمے میں پاکستان کی سپریم کورٹ نے اپنایا تھا کہ انقلاب غیر دستوری تھا لیکن جب اس نے استقرار پالیا اور غلبہ بظاہر مستقل ہوا تو وہ جائز حکومت کی طرح ہو گیا۔ PLD ۱۹۵۸ SC533 ۔

کون ہے؟)[45] اس اقتباس کے آخر میں جو وجہ ذکر کی گئی ہے وہ اہم ہے۔ یہاں متاخرین نے فتوی تبدیل نہیں کیا بلکہ صرف یہ بتایا ہے کہ فتوی کے کس جزو پر عمل کیا جائے اور کیوں کیا جائے؟ چنانچہ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ اصل سوال پر واپس آیا جائے کہ امامِ برحق کون ہے اور حکومت کے خلاف اٹھنے کے لیے شرعی جواز کیا ہے؟

آگے علامہ شامی "جامع الفصولین" سے وہ اہم اقتباس نقل کرتے ہیں جس کا حوالہ اوپر علامہ حصکفی نے دیا تھا(وتمامه فی جامع الفصولین):

ان المسلمین اذا اجتمعوا علی امام وصاروا آمنین، فخرج علیه طائفة من المؤمنین؛ فان فعلوا ذلک لظلم ظلمهم به، فَهم لیسوا من اهل البغی؛ و علیه ان یترک الظلم و ینصفهم- و لا ینبغی للناس ان یعینوا الامام علیهم لان فیه اعانةَ علی الظلم؛ و لا ان یعینوا تلک الطائفة علی الامام ایضاً لان فیه اعانةَ علی خروجهم علی الامام ۔[46]

(جب مسلمان کسی حکمران پر متفق ہوں اور امن سے رہتے ہوں اور ایسے میں اس کے خلاف مومنوں کا کوئی گروہ اٹھے تو دیکھیں گے کہ اگر وہ اس وجہ سے اٹھے ہوں کہ حکمران نے ان کے خلاف کوئی ظلم کیا ہو تو اس حالت میں وہ اہلِ بغی نہیں ہیں۔ چنانچہ حکمران پر لازم ہو گا کہ ان پر ظلم ترک کر دے اور ان کے ساتھ انصاف کرے۔ اس حالت میں عام لوگوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں کے خلاف حکمران کی مدد کریں کیونکہ یہ ظلم میں اس کی مدد ہو گی؛ نہ ہی ان کے لیے جائز ہو گا کہ وہ ان اٹھنے والوں کی مدد کریں کیونکہ یہ حکمران کے خلاف نکلنے میں مدد ہو گی۔)

علامہ شامی اس اقتباس کی تائید کرتے ہیں لیکن اس آخری بات کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اور آگے قرار دیتے ہیں کہ ان مظلوموں کی مدد لازم ہے۔ اس بات پر آگے بحث آرہی ہے۔

45۔ ردالمحتار، ج۶، ص۴۱۱۔

46۔ ایضاً، ص۴۱۱-۴۱۲۔

اس کے بعد علامہ تمر تاشی کے متن میں حکمران کے انتخاب کے جائز طریقوں پر بحث ہوئی ہے جس میں انھوں نے بنیادی نکتہ یہ ذکر کیا ہے کہ حکمران کے فیصلے قانوناً تب نافذ ہوتے ہیں جب اسے لوگوں پر قہر اور غلبہ حاصل ہو اور وہ اپنے فیصلوں کی تعمیل ان سے کروا سکے:[47]

والامام یصیر اماما بالمبایعة من الاشراف و الاعیان، و بان ینفذ حکمه فی رعیته خوفاً من قهره و جبروته- فان بایع الناس و لم ینفذ حکمه فیهم لعجزه، لایصیر اماما- فاذا صار اماما فجار، لا ینعزل — ان کان له قهر و غلبة؛ و الّا، ینعزل به-[48]

(حکمران دو طریقوں سے حکمران بنتا ہے: یا تو معاشرے کے اشراف اور نامی گرامی لوگ اس کی بیعت کریں یا اس کے غلبے اور دبدبے کے خوف کی وجہ سے اس کا حکم لوگوں پر نافذ ہو۔ پس اگر لوگ اس کی بیعت کریں اور وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے ان پر اپنا فیصلہ نافذ نہ کر سکے تو وہ حکمران نہیں بنتا۔ پھر جب وہ حکمران بنے اور ظلم کرے تو ظلم کی وجہ سے خود بخود معزول نہیں جب تک اس کے پاس قہر اور غلبہ ہو؛ لیکن اگر قہر یا غلبہ نہ ہو تو ظلم کی بنا پر وہ خود بخود معزول ہو جاتا ہے۔)

اس مقام پر علامہ شامی نے المسایرة سے ایک اور اہم اقتباس پیش کیا ہے:

لو تعذر وجود العلم و العدالة فیمن تصدی للامامة، و کان فی صرفه عنها اثارة فتنة لا تُطاق، حکَمنا بانعقاد امامته کی لا تکون کمن یبنی قصراً و یهدم مصراً- و اذا تغلّب آخر المتغلب و قعد مکانه، انعزل الاول و صار الثانی اماما- و تجب طاعة الامام عادلاً کان او جائراً ، اذا لم یخالف الشرع۔ [49]

(اگر علم اور عدالت کی شرائط اس شخص میں پوری نہ ہوں جو امامت کے لیے اٹھا ہو اور اسے ہٹانے میں ایسا فتنہ ہو جس کا سامنا کرنے کی طاقت نہ ہو، تو ہم کہیں گے کہ اس کی امامت منعقد ہو گئی تاکہ اس شخص کی طرح معاملہ نہ ہو جو محل بناتا ہے اور شہر برباد کرتا ہے۔ پھر اگر اس متغلب پر کوئی اور شخص غلبہ پا لے اور اس کی جگہ بیٹھ جائے، تو اسی اصول پر پہلا معزول ہو جائے گا اور دوسرا امام بن جائے گا۔ اور حکمران کی اطاعت (جائز احکام میں) واجب ہے خواہ وہ فی نفسہ عادل ہو یا ظالم، جب تک وہ شریعت کی مخالفت نہ کرے۔)

47۔ بہ الفاظِ دیگر، جو حکومت "رِٹ" کھو بیٹھے وہ سندِ جواز بھی کھو بیٹھتی ہے۔

48۔ ایضاً، ص ۴۱۴۔

49۔ ایضاً۔

یہ آخری بات سب سے اہم ہے کیونکہ اسی سے بحث اس طرف واپس مڑ جاتی ہے کہ کن حالات میں حکمران کی معزولی واجب ہو جاتی ہے۔ علامہ تمرتاشی نے کہا تھا کہ حکمران ظلم کی وجہ سے خود بخود معزول نہیں جب تک اس کے پاس قہر اور غلبہ ہو۔ اس پر علامہ شامی نے حاشیے میں "شرح المقاصد" سے یہ اہم اقتباس پیش کیا ہے:

ينحل عقد الامامة بما يزول به مقصود الامامة، كالردة و الجنون المطبق و صيرورته اسيراً لا يرجى خلاصه؛ و كذلک بالمرض الذی ينسه المعلوم؛ و بالعمی و الصمم و الخرس؛ و كذا بخلعه نفسه لعجزه عن القيام بمصالح المسلمين، و ان لم يكن ظاهراً بل استعشره فی نفسه، و عليه يحمل خلع الحسن نفسه و اما خلعه لنفسه بلا سبب، ففيه خلاف- و كذا فی انعزاله بفسق- و الاكثرون علی انه لا ينعزل، و هو المختار من مذهب الشافعی و ابی حنيفة رحمهما الله تعالی- و عن محمد روايتان- و يستحق العزل بالاتفاق-[50]

(عقد امامت ان اسباب سے ختم ہو جاتا ہے جن سے امامت کے مقاصد زائل ہوتے ہیں، جیسے ارتداد یا جنونِ مطبق یا اس کا اس طرح قید ہو جانا کہ رہائی کی امید نہ رہے۔ یہی حکم اس مرض کا بھی ہے جو اس سے معلومات بھلادے اور اسی طرح بینائی چلے جانے، بہرے پن اور گونگے پن کا بھی۔ اسی طرح جب وہ اپنے آپ کو اس بنیاد پر معزول کردے کہ وہ خود کو مسلمانوں کے مصالح کے قیام کے لیے عاجز پائے، خواہ بظاہر اس میں ایسا عجز نہ ہو لیکن وہ صرف دل میں ایسا محسوس کرے؛ اور سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کا خلافت چھوڑنا اسی پر محمول کیا جائے گا۔ البتہ جب وہ کسی سبب کے بغیر خود کو معزول کردے تو اس کی خلافت ختم ہونے پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی طرح اس امر پر بھی اختلاف پایا جاتا ہے کہ کیا فاسق ہونے سے وہ خود بخود معزول ہو جاتا ہے؟ اکثریتی رائے یہ ہے کہ خود بخود معزول نہیں ہوتا۔ یہی امام شافعی اور امام ابو حنیفہ رحمہما اللہ تعالی کے مذہب کی مختار رائے ہے۔ امام محمد سے اس مسئلے میں دو روایتیں ہیں۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ فاسق ہو جانے پر وہ معزولی کا مستحق ہو جاتا ہے۔)

اس کے بعد علامہ شامی نے علامہ ابن الہمام کی تصنیف "المسايرة" سے اقتباس دیا ہے جس میں قرار دیا گیا ہے: يستحق العزل ان لم يستلزم فتنة-[51] (وہ معزولی کا مستحق ہو جاتا ہے اگر اس سے لازماً فتنہ نہ برپا ہوتا ہو)۔ آگے انھوں نے اس سے زیادہ واضح عبارت "شرح المواقف" سے نقل کی ہے:

50۔ ایضاً، ص ۴۱۵۔

51۔ ایضاً۔

ان للامة خلع الامام وعزله بسببٍ يوجبه، مثل ان يوجد منه ما يوجب اختلال احوال المسلمين و انتكاس امور الدين، كما كان لهم نصبه و اقامته لانتظامها و اعلائها- و ان ادى خلعه الى فتنة، احتمِل ادنى المضرتين ۔ [52]

(جب ایسا سبب ہو جو امام کا ہٹانا اور معزول کرنے واجب کر دے، جیسے اس میں کوئی ایسی بات پائی جائے جو مسلمانوں کے حالات کو نقصان پہنچائے اور دینی امور میں خلل پیدا کرے، تو اسے ہٹانے اور معزول کرنے کا اختیار اسی طرح امت کے پاس ہے جیسے ان مقاصد کے حصول کے لیے اسے مقرر کرنے اور اس منصب پر فائز کرنے کا اختیار اس کے پاس ہے۔ اگر اسے ہٹانے کے نتیجے میں فتنہ پیدا ہو تو دونوں برائیوں میں سے کم تر برائی برداشت کی جائے گی۔)

کیا یہ بعینہ وہی موقف نہیں ہے جو امام ابو حنیفہ نے خراسانی فقیہ ابراہیم الصائغ کے سامنے پیش کیا تھا؟!

کیا اس ظالم حکمران کے خلاف اٹھنے والوں کی مدد کرنی چاہیے؟ یہاں علامہ شامی نے علامہ ابن الہمام کی شرحِ ہدایہ "فتح القدیر" سے یہ اہم اقتباس پیش کیا ہے جو اس بحث میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے: و يجب على من اطاق الدفع ان يقاتل مع الامام ، الا ان ابدوا ما يجوز لهم القتال ، كان ظلمهم ظلماً لا شبهة فيه ؛ بل يجب ان يعينوهم حتى ينصفهم و يرجع عن جوره ۔ [53](جس شخص میں دفاع کی طاقت ہو اس پر واجب ہے کہ باغیوں کے خلاف لڑنے میں امام کا ساتھ دے، الا یہ کہ وہ لڑنے والے ایسی بات پیش کریں جس کی بنا پر ان کے لیے حکمران کے خلاف لڑنا جائز ہو، جیسے حکمران نے ان پر یا کسی اور پر ایسا ظلم کیا ہو جس کے ظلم ہونے میں کوئی اشتباہ نہ ہو۔ بلکہ ایسی حالت میں ان لوگوں پر واجب ہے کہ حکمران کے خلاف اٹھنے والوں کی مدد کریں یہاں تک کہ وہ ان سے انصاف کرنے پر اور ظلم چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔)

پیچھے "جامع الفصولين" کی عبارت گزری تھی کہ ایسی حالت میں حکمران کی مدد بھی نہیں کرنی چاہیے اور اس کے خلاف اٹھنے والوں کی مدد سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ علامہ شامی نے اس موقف اور "فتح القدير" کی اس عبارت میں توفیق کی راہ یہ بتائی ہے کہ جب امکان یہ ہو کہ حکمران کے خلاف اٹھنے والوں کی مدد کی جائے تو حکمران "بغی" سے باز آجائے گا تو پھر ان اٹھنے والوں کی مدد کرنی چاہیے لیکن اگر اس طرح فساد زیادہ پھیل جانے کا اندیشہ ہو تو

52۔ ایضاً۔

53۔ ایضاً، ص ۴۱۶۔

پھر کسی فریق کی بھی مدد نہیں کرنی چاہیے(و یمکن التوفیق بان وجوب اعانتھم اذا امکن امتناعه عن بغیه؛ و الّا، فلا)۔[54] یہاں بالخصوص اس بات پر نظر رہے کہ بغی کی نسبت حکمران کی طرف کی گئی ہے، نہ کہ اس کے خلاف اٹھنے والوں کی طرف۔

نتائج بحث

اس مقالے میں پیش کی گئی تفصیل سے معلوم ہوا کہ خروج کے متعلق امام ابو حنیفہ کا موقف چار بنیادوں پر قائم تھا: ایک یہ کہ سیدنا علی کرّم اللہ وجہہ اپنی تمام جنگوں میں حق پر تھے اور اس لیے خروج و بغی کے متعلق مسائل میں آپ کو ہی امام کی حیثیت حاصل ہے؛ دوسری یہ کہ مسلمانوں کے حکمران کے لیے عادل ہونا شرط ہے؛ تیسری یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمام مسلمانوں کا فریضہ ہے؛ اور چوتھی یہ کہ اگر ظالم حکمران کو معزول کرنے کی صورت میں بڑے فساد کا قوی اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں خونریزی سے بچانے کے لیے ایسے حکمران کی حکومت کو برداشت کیا جائے گا۔

مقالے میں حنفی مذہب کی معتبر اور مستند کتب سے جزئیات پیش کر کے یہ بھی دکھایا گیا کہ ان چاروں اصولوں کو حنفی مذہب نے قبول کیا ہے۔ چنانچہ حنفی مذہب کے متقدمین مشائخ، جیسے امام جصاص، امام سرخسی، امام کاسانی اور امام مرغینانی، ہوں، درمیانی دور کے ممتاز محقق، جیسے علامہ ابن الہمام ہوں، یا خاتمۃ المحققین علامہ شامی ہوں، سب نے اس معاملے میں امام ابو حنیفہ کے موقف کی اتباع کرتے ہوئے ان چاروں اصولوں کو قبول کیا ہے اور انھی پر اپنی رائے قائم کی ہے۔ اس لیے خروج کے مسئلے پر امام ابو حنیفہ کے موقف اور حنفی مذہب میں فرق کے قائلین کی رائے کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ بعض فقہی عبارات سے جس اختلاف کے لیے استدلال کیا جاتا ہے، ان عبارات میں خروج کے جواز یا وجوب کے لیے امام ابو حنیفہ کی مذکورہ شرائط ہی پائی نہیں جاتیں اور اس لیے ان عبارات سے یہ استدلال مناسب نہیں ہے کہ حنفی مذہب اس مسئلے میں مختلف ہے۔

واللہ اعلم بالصواب، والیه المرجع والمآب۔

54۔ ایضاً۔